مثنوی 'سحرالبیان'، 'گلزارِنسیم' اور 'زہرِ عشق' پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق و تنقید کا جائزہ

A Review of Dr. Farman Fateh Puri's Research and Criticism on Masnavi "Sahr Ul Bayan", "Gulzar E Naseem" and "Zahr E Ishq"

عاصمہ کوثر [i]

Abstract:

The tradition of poetic tales in Urdu has existed for centuries and continues to be an important part of literature. Dr. Farman Fatehpuri, a renowned figure in Urdu literature, has critically evaluated the Urdu poetic tales up until 1870 in his PhD thesis, "Urdu ki Manzoom Daastanein" Masnavi, a type of poetic tale, is a significant part of world literature and reflects the grandeur of this genre. The book "Urdu ki Behtreen Masnaviyan" by Dr. Farman Fatehpuri evaluates three significant masnavis, including "Sehrul Bayan," "Gulzar Naseem," and "Zehr-e-Ishq." Dr. Fatehpuri analyses their characters, plot, dialogue, and sequence of events. "Sehrul Bayan" by Meer Hassan portrays the characteristics of the characters, social values, and events of the time, while "Gulzar Naseem" by Diya Shankar skilfully combines poetry, emotional expression, and elaborate language to reflect the essence of the Lucknow society. "Zehr-e-Ishq" by Nawab Mirza Shaooq is known for its emotional intensity and impactful use of language. Dr. Farman Fatehpuri's evaluation of these works provides insight into their literary and artistic value and contribution to Urdu literature.

Keywords: *Urdu poetic tales, Masnavi, Characters, plot, dialogue, sequence of events, emotional expression, elaborate language, literary criticism, Urdu literature.*

اردو میں منظوم کہانیوں کی روایت صدیوں سے موجود ہے اور ادب کا ایک اہم حصہ رہی ہے۔ اردو ادب کی معروف شخصیت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے "اردو کی منظوم داستانیں" میں ۱۸۷۰ء تک کی اردو مثنویوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مثنوی، شاعرانہ کہانی کی ایک قسم اور عالمی ادب کا ایک اہم حصہ ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "اردو کی بہترین مثنویاں" میں تین اہم مثنویوں کا جائزہ لیا گیا ہے، جن میں "سحر البیان"، "گلزار نسیم" اور "زہرِ عشق" شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان کے کرداروں، پلاٹ، مکالموں اور واقعات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ میر حسن کی "سحر البیان" اس وقت کے کرداروں، سماجی اقدار اور واقعات کی خصوصیات کو پیش کرتی ہے، جب کہ دیا شنکر کی "گلزار نسیم" لکھنؤ کے معاشرے کی عکاسی کرنے کے لیے شاعری، جذباتی اظہار اور وسیع زبان کو مہارت سے یکجا کرتی ہے۔ نواب مرزا شوق کی "زہرِعشق" اپنی جذباتی شدت اور زبان کے اثر انگیز استعمال کے لیے جانی جاتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ان تصانیف کا جائزہ ان کی ادبی اور فنی قدر اور اردو ادب میں بصیرت فراہم کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ: اردو منظومات، مثنوی، کردار، پلاٹ، مکالمے، واقعات کی ترتیب، جذباتی اظہار، وسیع زبان، ادبی تنقید، اردو ادب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، سحر البیان، گلزارِ نسیم، زہرِ عشق۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا نام کسی بھی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ ایک ایسے نامور عالم ہیں جن کے علم کی مختلف جہات ہیں۔ ان کی علمی بصیرت ان کی بے شمار تصانیف ہیں جو متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ لسانیات، تحقیق، تنقید، غالب شناسی، اقبالیات، فکشن، شعر اور نثری موضوعات ان کی تصانیف کا خاصہ

[i] پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان (Corresponding Author)

ہیں۔

اردو ادب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مقام ایک بہترین محقق، نقاد اور عالم کا ہے۔ ویسے تو یہ شاعر اور تخلیق کار بھی ہیں لیکن بطور محقق و نقاد ان کی حیثیت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے ادب کے جس موضوع پر بھی قلم اُٹھایا اس میں تحقیق و تنقید کے حوالے سے مکمل معلومات فراہم کیں۔ ان کی فراہم کردہ معلومات تاریخی ہوں یا علمی مستند حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی علمی و ادبی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے۔ اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقا ۱۹۶۴ء تدریس اردو ۱۹۶۲ء اردو املا اور رسم الخط ۱۹۷۷ء فن تاریخ گوئی اور اردو میں اس کی روایت ۱۹۸۴ء، اردو ہندی تنازع ۱۹۷۷ء تاویل و تعبیر ۱۹۸۲ء اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ ۱۹۹۰ء قومی یک جہتی، اردو اور پاکستان ۱۹۹۲ء قمر زمانی بیگم ۱۹۷۲ء ڈاکٹر محمود حسین شخصیت اور کارنامے ۱۹۷۶ء، مولانا حسرت موہانی شخصیت اور فن ۱۹۷۷ء سر سید احمد آن دی پریزنٹ اسٹیٹ آف انڈین پالیٹکس ۱۹۸۴ء، مولانا محمد علی جوہر حیات اور کارنامے ۱۹۷۹ء، تحریک پاکستان اور قائدِاعظم ۱۹۷۶ء، خطباتِ محمود ۱۹۸۳ء، نیاز فتح پوری ۱۹۷۲ء، اردو کی نعتیہ شاعری ۱۹۷۴ء، اردو کی منظوم داستانیں ۱۹۷۰ء، اردو کی ظریفانہ شاعری ۱۹۸۸ء، اردو افسانہ نگاری ۱۹۸۲ء، غالب شاعر امروز فردا ۱۹۷۰ء، اقبال سب کے لیے ۱۹۷۷ء، میر انیس حیات اور شاعری ۱۹۷۶ء۔

یہ تمام تصانیف مختلف موضوعات کو سامنے لے کر آتی ہیں جہاں ان کی کئی کتب ترتیب و تدوین کے حوالے سے اہم مانی جاتی ہیں۔ وہیں تحریک پاکستان اور پاکستانی ثقافت کی بھی عکاس ہیں۔ اس کے علاوہ علمی، ادبی اور فنی حوالے سے بھی ان کی تصانیف بہت اہم ہیں۔ خاص طور پر ان کا مقام اصناف ادب میں اور تحقیق و تنقید کے حوالے سے کہ ان کی مستند کتابیں ادب کے طلبہ کے لیے حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہاں ہمارا موضوع فرمان صاحب کی مختلف جہات کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ مثنوی کے فن، منظوم داستانوں کی روایت اور اردو ادب کی بہترین مثنویاں کا جائزہ لینا ہے۔

اس سلسلے میں ان کی معروف تصنیف 'اردو کی منظوم داستانیں' ہیں۔ دراصل یہ ان کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے جس میں ۱۸۷۰ء (۱۲۸۷ھ) تک کی اردو منظوم داستانوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالہ کو انجمن ترقی اردو کراچی نے ۱۹۷۱ء میں پہلی بار شائع کیا۔

اردو میں منظوم داستانوں کا سلسلہ شاعری کے ابتدائی دور سے ہی ہو جاتا ہے اور بیسویں صدی عیسوی کے آخر تک کسی نہ کسی طور جاری رہتا ہے۔ منظوم داستانوں کی تاریخ نثری داستانوں کے مقابلے میں تقریباً تین سو سال پرانی ہے۔ فرمان فتح پوری 'اردو کی منظوم داستانیں' کے دیباچہ 'کتاب سے پہلے' میں لکھتے ہیں:

> ''صرف اردو ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر متمدن قوم اور شائستہ زبان میں شروع سے منظوم داستانوں کو قبول عام حاصل رہا ہے اور آج جسے عالمی کلاسیکل ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے اس میں زیادہ حصہ منظوم داستانوں کا ہے۔ منظوم داستانیں صرف یہی نہیں کہ قدیم ترین صنف سخن ہونے کی حیثیت سے تاریخی اہمیت کی حامل ہے بلکہ ادبی و فنی نقطۂ نظر سے بھی ان میں عظمت و بزرگی کے آثار ملتے ہیں اور اس حد تک ان کا شمارہ ہمیشہ زندہ ادب میں کیا جائے گا۔''[۱]

منظوم داستانوں کو جملہ فنون پر تاریخی اعتبار سے اولیت حاصل ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن کے جو قدیم ترین نقوش و آثار اب تک ملے ہیں ان میں سے اکثر منظوم داستانوں کے توسط سے سامنے آئے، منظوم داستانیں نثری قصوں سے بالکل الگ ہوتی ہیں اور 'مثنوی' کی شکل میں ہوتی ہیں۔ مثنوی اپنی وسعت اور ہمہ گیری، قافیہ کی آسانی کی وجہ سے منظوم داستانوں کے لیے موزوں ترین اور مفید ترین صنف ہے۔ داستان کے تمام لوازم و منازل کو جس آسانی اور آزادی سے مثنوی کی صورت میں نظم کیا جا سکتا ہے وہ کسی دوسری صنف میں ممکن نہیں ہے۔ صرف یہ واحد صنف ہے جس میں قافیہ اور ردیف کی دشواریاں کم ہی ملتی ہیں۔ مولانا شبلی مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔''[۲]

لفظ 'مثنوی' مشتق ہے مثنیٰ سے جس کے معنی 'دو' کے ہیں۔ اس کے دو مصرعے ہوتے ہیں۔ اصنافِ سخن میں 'مثنوی' ایرانیوں کی ایجاد ہے۔ مثنوی کا باوا آدم رودکی ہے۔ فردوسی نے 'شاہنامہ' میں اس کو درجہ کمال تک پہنچا دیا، اور نظامی نے 'پنج گنج' میں مثنوی کو حقائق و معرفت سے آشنا کیا۔ مولانا روم کی مثنوی ''ہست قرآں در زبان پہلوی'' کہلاتی ہے۔

اصطلاح شاعری میں 'مثنوی' اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کی ہر بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور سب اشعار ایک ہی بحر میں ہوں۔ نہ تو اس میں قصیدہ کی طرح ابیات کی تعداد محدود ہے اور نہ ہی غزل کی طرح ردیف و قافیہ کی قید ہے۔

اردو شاعری کے ارتقا اردو کی لسانی خصوصیات، شمالی ہند کی زبان و بیان پر دکن کے اثرات اور دکن پر شمالی ہند کے نقوش اور مثنوی کے عروج و زوال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ قدیم دکن معاشرت و تہذیب کے جیسے مکمل و خوب صورت مرقعے ان میں ملتے ہیں۔ وہ کسی اور صنف میں نظر نہیں آتی۔ تاریخی نقطہ نظر سے اردو کی پہلی مثنوی فخر الدین نظامی دکنی کی 'کدم راؤ پدم راؤ' ہے۔ نظامی بہمنی دور کا شاعر تھا۔ غواصی کی 'پھول بن' احمد جنید کی مثنوی 'ماہ پیکر' نصرتی کی 'علی نامہ'، 'گلشن عشق'، ملا وجہی کی 'قطب مشتری' خاص طور پر قابل ذکر مثنویاں ہیں۔

میر تقی میر نے بھی کئی مثنویاں لکھیں، میر درد کے بھائی میر اثر کی مثنوی 'خواب و خیال' لکھی۔ اسی دور کی سب سے اہم اور مشہور مثنوی میر حسن کی 'سحر البیان' ہے۔ جرأت نے دو مثنویاں 'برسات کی ہجو' اور 'حسن و عشق' لکھیں۔ واجد علی شاہ اختر کی 'حزن اختر' دلچسپ مثنویاں ہیں۔

دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' مقبولیت کی سند حاصل کر چکی ہے۔ مرزا شوق کی مثنوی کو بھی کافی شہرت نصیب ہوئی۔ ان کی مثنوی 'زہرِ عشق' ایک عمدہ شاہکار ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو مثنوی نگاری سے خاص دلچسپی رہی ہے، مثنوی کے موضوع پر ان کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

- اردو کی منظوم داستانیں ۱۹۷۱ء
- دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ ۱۹۷۲ء
- نواب مرزا شوق کی تین مثنویاں ۱۹۷۱ء
- اردو کی بہترین مثنویاں ۱۹۹۳ء

فرمان صاحب 'اردو کی بہترین مثنویاں' میں لکھتے ہیں :

> "مثنویات پر تحقیقی و تنقیدی بحث کے آغاز سے پہلے ایک التزام یہ بھی کیا گیا ہے کہ ہر مثنوی کے مصنف کا سوانحی خاکہ مختصر الفاظ میں دے دیا گیا۔"[۳]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے 'اردو کی بہترین مثنویاں' میں مثنوی 'سحر البیان'، مثنوی 'گلزار نسیم' اور 'زہرِ عشق' پر مفصل بحث کی ہے۔ وہ مثنوی کے موضوع، اشعار اور بحر و وزن کے متعلق لکھتے ہیں :

> ''مثنوی میں موضوع کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ ہر قسم کے داخلی و خارجی موضوع پر مثنوی کہی جاسکتی ہے۔ نہ تو مثنوی کے اشعار کی تعداد مقرر ہے اور نہ بحر وزن کی تخصیص۔ مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل مثنوی، جس بحر و وزن میں چاہے کہہ سکتے ہیں۔''[۴]

مولانا شبلی نے مثنوی کی خصوصیات کو جامع انداز میں بیان کیا۔ حسن ترتیب، کردار نگاری، واقعہ نگاری کو مثنوی نگار کا کمال فن کہا۔ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

> ''چوں کہ شاعری در حقیقت ایک قسم کی مصوری ہے اس لیے جب تک واقعہ نگاری میں اس قسم کی خصوصیت نہ دکھائی جائے کسی واقعہ کی اصل اور صحیح تصویر ذہن میں نہیں آسکتی۔''[۵]

یہ وہ تمام خصوصیات ہیں جن پر کسی افسانوی مثنوی کی کامیابی کا انحصار ہے۔ ان خوبیوں کی اصل شاعر کا موثر انداز بیان ہے۔ بغیر اثر انگیز لب و لہجہ اور زبان کی چاشنی کے منظوم قصے میں قبول عام حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ افسانوی مثنویوں میں ایک چیز یہ بھی ہے کہ جو اس کی خوبی کی بجائے عیب بن جاتی ہے۔ اردو کی تمام افسانوی مثنویوں میں آغاز داستان سے پہلے اسی بحر و وزن میں حمد، نعت، منقبت، بادشاہ وقت کی مدح، مناجات اور سبب تالیف کے عنوان سے ہزاروں اشعار ملیں گے۔ اگر یہ چیزیں نثر میں ہوتیں تو شاید اتنی طویل نہ ہوتیں۔ اردو کی سب سے اچھی مثنوی سحر البیان بھی اس عیب سے مبرا نہیں۔ داستان کے آخر میں مناجات یا شاعرانہ تعلی اس کے آخری تاثر کو ذہن سے زائل کر دیتے ہیں۔

اردو کے منظوم قصے بالعموم مثنوی کی شکل میں نظم کیے گئے ہیں۔ اردو شعرا غزل کا رنگ داستانوں میں بھی شامل کر دیتے ہیں۔ سحر البیان اور گلزار نسیم میں میر حسن اور نسیم نے اپنی اپنی غزلوں کو جگہ دی۔ بعض قصوں میں اردو غزل کے ساتھ ساتھ فارسی غزلیں بھی نقل کی گئی ہیں۔ اس سے وزن و آہنگ کی خوبصورتی تو پیدا ہو گئی لیکن داستان کی دلچسپی برقرار نہ رہ سکی۔ مثنوی کو بیان کرنے کے لیے مثنوی نگار کو باکمال ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں :

> ''داستان کیسی بھی ہو اگر مثنوی نگار شاعر باکمال ہو تو ادنی سے ادنی واقعہ اور معمولی سے

معمولی داستان بھی نظر گیر اور دلکش ہو جاتی ہے۔ ذرہ آفتاب اور قطرہ دریا بن جاتا ہے۔
کم از کم سحر البیان، گلزار نسیم اور زہر عشق کے سلسلے میں یہی ہوا ہے۔ میر حسن، دیا شنکر
نسیم اور مرزا شوق نے اپنے ذاتی اوصاف سے ان مثنویوں میں کائناتی رنگ بھر دیا۔"[۶]

'اردو کی بہترین مثنویاں' تنقید و تحقیق کا امتزاج ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو کی تین مثنویاں شامل کی ہیں۔

۱۔ سحر البیان از میر حسن
۲۔ گلزارِ نسیم از دیا شنکر نسیم
۳۔ زہر عشق از نواب مرزا شوق

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ان تینوں مثنیوں کے پس منظر، موضوع، محرک، داستان، مآخذ، کردار واقعات، مناظر اور زبان و بیان سب کا جائزہ لیا۔

'سحر البیان' کے حوالے سے فرمان فتح پوری نے سحر البیان اور میر حسن اور ان کا عہد، پس منظر، فوق الفطرت عناصر، کردار اور اس کی خصوصیات، واقعات نگاری، سماج تہذیبی زندگی کا عکس، میر حسن کا معاشقہ اور سحر البیان کے اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ وہ لکھتے ہیں:

"اردو کی طویل مثنویوں میں جو شہرت و قبولِ عام 'سحر البیان' یعنی بے نظیر و بدر منیر کی داستان کو حاصل ہوا وہ کسی دوسری منظوم داستان کو حاصل نہ ہوا۔ شمالی ہند میں افسانوی مثنویوں کے قبول عام کا دور دراصل سحر البیان کے بعد شروع ہوتا ہے۔ 'سحر البیان' طویل مثنویوں یا نظموں کا نقشِ اول تھا۔"[۷]

'سحر البیان' میر حسن کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مثنویاں لکھ چکے تھے۔ پہلی طویل مثنوی (۱۱۸۳ھ)، دوسری مثنوی رموز العارفین (۱۱۸۸ھ)، مثنوی گلزار ارم (۱۱۹۲ھ) یہ مثنوی سحر البیان سے کسی طرح کم نہیں۔

مثنوی تہنیتِ عید ۱۱۹۰ھ اور مثنوی قصرِ جواہر ۱۱۹۹ھ، ان دونوں مثنویوں کے بعض مناظر پر مثنوی سحر البیان کے مناظر کی بنیاد رکھی گئی۔

۱۱۸۹ء میں شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد جب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے لکھنؤ

کو دارالحکومت ٹھہرایا اور علم و ادب کی خوب قدر دانی فرمائی کہ لکھنؤ ارباب کمال کا مرکز بن گیا۔ میر حسن فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے اور جلد ہی دربار تک رسائی حاصل کر لی۔ بادشاہ کو شفیق و ادب نواز پا کر سحر البیان لکھنا شروع کر دی۔ ۱۱۹۹ھ میں مثنوی تمام کر کے بادشاہ کے حضور پیش کر دی۔ فرمان صاحب مثنوی 'سحر البیان' کی تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میر حسن کو اس منظوم داستان کی تکمیل میں کتنا وقت دینا پڑا۔ اس کا تعین کرنا مشکل ہے کوئی ایسی خارجی شہادت اب تک سامنے نہیں آئی جس سے اس کی مدت تصنیف کا سراغ لگایا جا سکے۔ قیاس یہ ہے کہ ۱۱۹۲ھ میں گلزار ارم کے خاتمہ پر انہوں نے سحر البیان کی طرف توجہ دی ہوگی۔ صاحب مثنوی کا دعویٰ تو یہ ہے کہ برسوں خون پانی کرنے کے بعد سحر البیان وجود میں آئی۔''[۸]

میر حسن کی نظر میں مثنوی سحر البیان کئی خصوصیات کی حامل تھی۔

نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجڑی مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان نہیں مثنوی ہے یہ 'سحر البیان'
رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام کہ ہیں یادگارِ جہاں یہ کلام

میر حسن کا یہ قصہ عام طور پر طبع زاد خیال کیا جاتا ہے۔ خود میر حسن نے بھی اس بات کا دعویٰ کیا کہ یہ کہانی انھوں نے کہیں سے مستعار نہیں لی۔ لیکن فرمان صاحب لکھتے ہیں کہ اگر اس کہانی کے مختلف اجزاء کو ذہن میں رکھ کر داستانوں پر غور کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ میر حسن اپنی کہانی پرانی کہانیوں کی مدد سے ترتیب دی ہے۔ یعنی ان کا قصہ طبع زاد نہیں بلکہ مختلف داستانوں سے ماخوذ ہے۔ حال آں کہ میر حسن اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کہانی انھوں نے کسی سے مستعار نہیں لی بلکہ خود مرتب کی ہے۔

فرمان فتح پوری بتاتے ہیں کہ سحر البیان کی کہانی کو ذہن میں رکھ کر قدیم داستانوں پر غور کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ میر حسن کا یہ قصہ واقعتاً طبع زاد نہیں بلکہ مختلف داستانوں اور قصوں کا رنگ اس میں پایا جاتا ہے۔ بعض ایسے رجحانات جن کی مدد سے سحر البیان کا قصہ ارتقائی منزلیں طے کرتا ہے وہ اردو اور فارسی کے قدیم قصوں سے ماخوذ ہیں۔ سحر البیان کے مآخذات میں نظامی کے 'سکندر نامے' اور نعمت خان عالی کی 'وقائع حسن و عشق' بھی شامل کر لیے جائیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ عالی اور نظامی دونوں کا اثر اس کی تکنیک

میں جھلکتا ہے۔ 'پدماوت' سحر البیان سے کوئی ڈھائی سو برس پہلے لکھی گئی تھی لیکن اس کا اثر بھی سحر البیان میں نظر آتا ہے۔ میر حسن کی اس مثنوی کی بات کی جائے تو کردار نگاری بہترین وصف موجود ہے۔اس میں بادشاہ سے لے کر ایک معمولی ملازم تک کا کردار غیر معمولی سلیقے سے بیان کیا گیا ہے۔

اہم کردار نجم النساء، بدر منیر اور بے نظیر ہیں۔ جو دہلی و لکھنوی دونوں کی معاشرت اور ماحول کو ظاہر کرتے ہیں۔

پروفیسر حبیب اللہ غضنفر، مثنوی سحر البیان کے حوالے سے کئی خامیوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ان کی باتوں کو تحقیقی انداز میں ثابت کیا۔ جیسے وہ نجم النساء کو ہی سحر البیان کی ہیروین قرار دیتے ہیں۔ دراصل نجم النساء کی بدولت ہی پوری داستان میں حرکت اور ہیرو ہیروین کے کردار میں فعالیت دکھائی دیتی ہے۔ مثنوی سحر البیان کا سب سے بڑا حسن اس کا حسن بیان ہے جس پر میر حسن کو بھی ناز ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں :

> ''سحر البیان میں ملکی و سیاسی حالات سے لے کر مذہبی سماجی اور اخلاقی، ادبی سارے حالات خوش سلیقگی سے نظم ہوئے ہیں اور اس کی یہی خصوصیات اسے اردو کی دوسری مثنویوں سے ممتاز کرتی ہیں۔''[۹]

میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' کے بعد اردو میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں۔ یہ مثنویاں زبان و بیان اور موضوعات کے لحاظ سے متنوع ہونے کے باوجود سحر البیان کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ ان کی مقبولیت و شہرت وقتی اور علاقائی حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ انیسویں صدی کے وسط میں دیا شنکر نسیم لکھنوی کی مثنوی 'گلزار نسیم' کے نام سے سامنے آئی۔ جس نے سحر البیان کی یاد تازہ کر دی بلکہ اس مثنوی کو سحر البیان کے ہم پلہ خیال کیا جانے لگا۔ اس لیے آج بھی جب سحر البیان کا نام آتا ہے تو ساتھ ہی 'گلزار نسیم' کا نام بھی ذہن میں آ جاتا ہے۔

'قصہ گل بکاولی' کو دیا شنکر نسیم نے نظم کر کے مثنوی کی صورت میں لکھا۔ یہ قصہ طبع زاد نہیں اردو میں پہلے سے موجود تھا۔ ۱۲۵۴ھ میں دیا شنکر نسیم نے اسے اردو نظم میں منتقل کیا۔ نسیم نے جس نثری قصے (گل بکاولی) کو نظم کیا وہ نہال چند لاہوری کا معلوم ہوتا ہے۔ جسے منشی نہال چند نے ۱۲۱۷ھ میں جان

گل کرسٹ کے حکم سے اسے فارسی سے اردو میں منتقل کیا اور 'مذہب عشق' نام رکھا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دیا شنکر نسیم اور ان کے عہد کے ساتھ ساتھ گلزار نسیم اور قصہ گل بکاولی، نثری قصے کا مصنف، قصہ گل بکاولی کے تاریخی ماخذ، مقامیت اور گلزار نسیم کی اشاعت و معرکہ کو نہایت خوبی سے بیان کیا۔ گلزار نسیم کا موضوع اور داستان کا خلاصہ، دبستان لکھنو کی پہلی طویل و کامیاب مثنوی، کردار، واقعات اور جذبات کی مصوری، سحر البیان اور گلزار نسیم کا تقابلی مطالعہ جیسے موضوعات پر بحث کی گئی۔ فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> "گلزار نسیم" لکھنو دبستان شعر کی پہلی طویل نظم ہے جس میں مثنوی اور قصہ دونوں کے لوازم کا لحاظ پایا جاتا ہے۔ اس میں کردار نگاری، جذبات کی مصوری، تسلسلِ بیان اور روانی کی کم و بیش وہی صفات و محاسن موجود ہیں جو منظوم داستانوں کے لیے بالعموم ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ اس کے حسنِ اختصار کا یہ عالم ہے کہ جس طرح پوری داستان میں کوئی شعر بھرتی کا نہیں۔"[۱۰]

واقعات و جذبات نگاری میں بھی نسیم کو کمال حاصل ہے۔ جذبات کی مصوری کی مدد سے نسیم کے بعض کرداروں کو دلچسپ اور جاندار بنا دیا ہے۔ گلزار نسیم کے اکثر کردار حتی کہ ہیروین تک فوق الفطرت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے ان میں قاری کے لیے وہ نفسیاتی کشش باقی نہیں رہ جاتی جس کے لیے سحر البیان کے کردار ممتاز ہیں۔ ان کے بعض کردار ایسی کامیابی سے سامنے لائے گئے ہیں کہ ان کے افعال و جذبات عام انسانی زندگی سے متعلق ہو گئے ہیں۔ ہیرو کا کردار تو بعض وجوہ سے انسانی ہوتے ہوئے بھی عام انسانی فطرت سے جداگانہ ہے۔ وفاداری عشق و محبت کا جذبہ، مصائب کو برداشت کرنے کی قوت ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک مثالی کردار ہے جس میں نیکی ہی نیکی کا عنصر ہے۔ برائی نام کو بھی نہیں۔ داستان کی ہیروین بکاولی البتہ فطرت کے عین مطابق ہے اور نسیم نے اس کو قصہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ قاری کی توجہ کا مرکز رہتی ہے۔ بکاؤلی کبھی محبوبہ کبھی عاشق و معشوق نما، کبھی بیٹی، کبھی رقاصہ، کبھی گھر کی مالکہ اور کبھی بیوی اور کبھی سہیلی بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کے کردار میں ہیرو کی طرح یکسانگی نہیں ہے۔ وہ نوخیز اَلھڑ لڑکی کی طرح بگڑے معاشرے کی لغزشوں کا بھی شکار ہوتی ہے۔ غصہ آتا ہے غضبناک ہو جاتی ہے۔ غرض بکاؤلی کا کردار عام انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"نسیم نے بکاؤلی کے کردار اور اس کے جملہ اوصاف و جذبات کو بڑی خوش سلیقگی سے پیش کیا ہے۔ دراصل بکاؤلی کی شخصیت و کردار کی جاذبیت و کشش نے پوری داستان کو سنبھالا دیا ہے۔"[۱۱]

سحر البیان اور گلزار نسیم دو مختلف ماحول کی پیداوار ہیں۔ اس لیے ان دونوں مثنویات کو ایک نقطہ نگاہ سے دیکھنا درست نہیں۔ لکھنوی معاشرت و تہذیب سے تعلق کی بنا پر گلزار نسیم لکھنوی معاشرت کی آئینہ دار ہے۔ ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:

"شاعری اور صفت گری، جذبات نگاری اور الفاظ کی شعبدہ کاری کو باہم ملا کر لکھنوی شعراء نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا۔ ہر رنگ کی نمایاں خصوصیات صنعت کو ٹھہرایا گیا۔ تشبیہ و استعارے میں سادہ اور نیچرل تشبیہات کے بجائے تشبیہ در تشبیہ یا پھر تشبیہوں کے اجزا کی تحلیل ترتیب پر توجہ دی گئی۔"[۱۲]

سحر البیان کی سادگی کے مقابلے میں 'گلزار نسیم' میں جو صناعی ملتی ہے وہ لکھنوی تہذیب کے عین مطابق ہے۔ گلزار نسیم میں نسیم کا طرز بیان ایسا ہے جیسا کوئی شخص شاعری کا کمال خیال کرے یا عیب۔ اسی بنا پر گلزار نسیم کو شہرت عام حاصل ہوئی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود گلزار نسیم کا تصنع اس کو سحر البیان کے مقابلے میں زیادہ پُر تاثیر نہیں بناتا۔ بقول رام بابو سکسینہ:

"اپنے ماحول کی طرح تصنع سے کوئی چیز خالی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کی حقیقی دلآویزی اور تاثیر میں کمی ہے۔"[۱۳]

گلزار نسیم کے بارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے کہ یہ مثنوی زبان اور شاعری کے اعتبار سے ہر طرح کے عیوب سے پُر ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود گلزار نسیم کی تاریخی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ گلزار نسیم سے قبل اور بعد میں 'گل بکاؤلی' پر جتنے بھی قصے نظم کیے گئے ان میں سے کوئی بھی 'گلزارِ نسیم' کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری گلزار نسیم کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں:

"اختصار و ایجاز کا فن حسن و خوبی سے گلزار نسیم میں برتا ہے۔ اردو شاعری میں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔ ایجاز کے لیے استعارات، کنایات، تلمیحات اور بعض صنائع کا استعمال

ناگزیر ہے۔ ان کے بغیر کلام کو بلیغ و مختصر بنانا مشکل ہے لیکن ان تمام چیزوں کو کلام میں برتنے کا سلیقہ سب میں نہیں ہوتا۔ اس لیے صنعتیں اکثر تزئین کلام کے بجائے اس کا عیب بن جاتی ہیں۔ نسیم کو چوں کہ تشبیہات، استعارات، کنایات، تمثیلات اور صنائع بدائع کے استعمال کا خاص سلیقہ ہے اس لیے کلام ایجاز و اختصار کا حامل ہوتے ہوئے بھی حسن و اثر سے عاری نہیں ہے۔"[۱۴]

پوچھا کہ اے آدمی پری رو　　انسان ہے پری ہے کون ہے تو
کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے　　ہے کونسا گل چمن کدھر ہے؟

مثنوی گلزار نسیم میں کئی ایسے مقامات آتے ہیں جہاں کرداروں کو گذشتہ داستانوں اور باتوں کو دہرانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس طرح سے ان مواقع پر تکرار کی وجہ سے اکثر کلام و بیان بے اثر و بے کیف ہو جاتا ہے۔ فرمان صاحب مثنوی گلزار نسیم کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہاں اس کے کچھ ایسے پہلوؤں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جو مثنوی کی اہمیت کو کم کر دیتے ہیں۔ اکثر مقامات پر مضمون کی بے جا تکرار سماعت پر گراں بار نہیں کرتی۔ اختصار مثنوی کی خوبی ہے۔ واقعہ نگاری مثنوی کی ایسی خصوصیات میں سے ہے کہ حالی نے واقعات وجذبات کی مصوری ہی کو منظوم داستان کا کمال ٹھہرایا ہے، لیکن جہاں اختصار نویسی ہو وہاں واقعات نگاری کا حق ادا ہونا ممکن نہیں تو ان کے لیے جزئیات سے بحث کرنا لازم ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نسیم کی جزئیات نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"شبلی کے مطابق محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، ظاہر ہے ایسی تصویروں کے لیے باریک بین مشاہدے اور گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری کے سلیقے کی بھی سخت ضرورت ہے۔ گلزار نسیم کے مصنف میں ان چیزوں کی کمی نہ تھی لیکن چوں کہ جزئیات نگاری سے انہوں نے دانستہ گریز کیا اور ایجاز نویسی کو کمال فن تصور کیا۔ اس لیے ان کے یہاں دشت و در، چاندنی رات، شادی بیاہ، جشن و جلوس، جنگل و پہاڑ اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ کی ایسی تصویریں نہ بن سکیں جو میر حسن کی خصوصیات ہے۔"[۱۵]

واقعات وجذبات کی مصوری کی نسیم کے بعض کرداروں کو دلچسپ اور جاندار بنا دیا ہے۔ حال آں

کہ گلزار نسیم کے اکثر کردار حتیٰ کہ ہیروین تک فوق الفطرت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے ان میں ہمارے لیے وہ نفسیاتی کشش نہیں رہ جاتی جس کے لیے سحر البیان کے کردار ممتاز ہیں۔ ہیروین بکاولی کا کردار ہیرو سے زیادہ مرکزی نوعیت کا ہے۔ بکاؤلی کبھی محبوبہ، کبھی عاشق معشوق نما کبھی بیٹی، کبھی رقاصہ کبھی گھر کی مالکہ، کبھی بیوی اور کبھی سہیلی بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کے کردار میں ہیرو کی طرح یکسانگی نہیں۔ وہ بگڑے ہوئے معاشرے کی نوخیز الھڑ لڑکی کی طرح لغزشوں کا شکار بھی ہوتی ہے، عشق بھی کرتی ہے اور عشق میں ثابت قدم بھی رہتی ہے۔ غصہ آتا ہے تو آگ بگولہ ہو جاتی ہے، غیرت آتی ہے تو حیا سے آنکھیں جھکا لیتی ہے۔ غرض بکاؤلی کا کردار متنوع، دلچسپ اور عام انسان کی فطرت کے مطابق ہے۔ نسیم نے اس کی کردار نگاری اور اس کے جذبات کی مصوری میں شاعرانہ حسن کاری کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ بکاؤلی کے کردار کے تمام اوصاف کو نسیم نے خوش اسلوبی سے پیش کیا۔ دراصل بکاؤلی کی شخصیت و کردار کی جاذبیت نے پوری داستان کو سنبھالا دیا۔

جہاں تک گلزار نسیم کے اسلوب کی بات ہے تو اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں رعایت لفظی کی کثرت ہے۔ آج کل تو رعایت لفظی کو کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے لیکن گلزار نسیم پر لکھتے ہوئے اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ نسیم کے دور میں یہ صنعتیں خاص طور پر مراعات النظیر، حسن تعلیل، تضاد اور تجنیس ولف و نشر نسیم کے کلام میں اکثر ملتی ہیں۔

رعایت لفظی بذات خود عیب نہیں۔ گلزار نسیم رعایت لفظی کو شروع سے آخر تک استعمال کیا۔ فرمان صاحب مزید لکھتے ہیں:

> ”گلزار نسیم میر حسن کے مقابلے میں یا 'سحر البیان' کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ یہ درست نہیں کیوں کہ گلزار نسیم تقلیدی رنگ سے یکسر پاک ہے اور شروع سے آخر تک ایک خاص رنگ میں رچی بسی ہوئی ہے اور یہ رنگ بحر، وزن، انداز بیان اور نفس مضمون کے ہر لحاظ سے سحر البیان سے بالکل جدا ہے۔ بعد میں آنے والی تمام مثنویاں تقلیدی رنگ میں سامنے آئیں جب کہ گزار نسیم اس عیب سے پاک ہے۔“[۱۶]

گلزار نسیم درحقیقت، تاریخی اعتبار سے مختلف ہے اس سے قبل اور مابعد 'گل بکاؤلی' کے جتنے قصے نظم ہوئے ان سب کی حیثیت زیادہ تر تاریخی ہے اور ان میں سے کوئی بھی شاعرانہ حسن و خوبی کے لحاظ سے

'گلزار نسیم' کے مرتبے کو نہیں پہنچا۔

سحر البیان اور گلزار نسیم کے بعد، اردو مثنویات کی تاریخ میں نواب مرزا شوق لکھنوی کا نام سامنے آتا ہے۔ نواب مرزا شوق کی مثنویوں میں آپ بیتی اور حقیقت نگاری کا رنگ جھلکتا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کی مثنویوں میں جگ بیتی اور سنی سنائی داستانیں تھیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نواب مرزا شوق کی مثنویاں کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"زہر عشق' اردو کی وہ مشور زمانہ مثنوی ہے جس کا نام عام و خاص سبھی نے سن رکھا ہے۔ یہ مانا کہ اردو کی مشہور ترین مثنویوں میں سحر ابیان اور گلزار نسیم کے نام بھی شامل ہیں لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے سوا دوسرے طبقے کے لوگ نہ ہو تو اس طرح کی مثنویوں سے واقف تھے اور نہ ان سے پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ 'زہر عشق' کی مقبولیت کی نوعیت ان سے بہت مختلف ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی آدمی ہو جس نے مثنوی زہر عشق نہ پڑھی ہو جو کھلے بندو نہیں پڑھ سکے انہوں نے چھپ کر پڑھی اور جو پڑھنے سے معذور ہیں انہوں نے اپنے دوستوں سے پڑھوا کر سنی ہے۔ پڑھنے اور سننے کا یہ ذوق و شوق کسی نہ کسی طور پر آج بھی لوگ ہیں باقی ہے اس مقبولیت کی وجہ مثنوی زہر عشق میں وہ ظاہری و معنوی خوبیاں ہیں جو اردو کی کسی اور مثنوی میں نظر نہیں آتی۔" [۱۷]

نواب مرزا شوق اردو شاعری کے عہد زریں سے تعلق رکھتے ہیں غالب، ذوق، شاہ نصیر، آتش انیس و دبیر ان کے ہم عصر شاعروں میں تھے مرزا شوق کی وجہ شہرت مثنوی ہے۔ بطور بہترین مثنوی نگار مرزا شوق نے اپنی مثنوی 'زہر عشق' میں کماں فن کا مظاہرہ کیا۔ اور 'زہر عشق' کی بدولت ایک با کمال اور منفرد اسلوب کے شاعر مانے جاتے ہیں۔

نواب مرزا شوق نے اپنی آپ بیتیوں کو داستانوں میں تبدیل کر دیا اور پھر مثنوی کا رنگ دیا۔ ان کی اس طرز کی داستانوں میں مثنوی 'زہر عشق' بلا شبہ اردو شاعری کا ایک شہ پارہ ہے۔ مومن کی بھی بعض مثنویاں شخصی نوعیت کی ہیں مرزا شوق نے بھی ان سے اثر قبول کرتے ہوئے اس طرز کی مثنویاں لکھیں۔ لیکن ان میں تقلیدی عناصر نہیں۔

زبان و بیان میں وہ مومن کے علاوہ اثر کی خواب و خیال سے متاثر ہوئے ہیں۔ مولانا حالی نے

شوق کے انداز بیاں کے سلسلے میں میر اثر کا خوشہ چیں بتایا ہے لیکن وہ ان کے کارناموں کو تقلیدی نہیں یکسر تخلیقی تسلیم کرتے ہیں۔ شوق کی مثنویوں میں فلسفیانہ نکتے اور مروج افسانوی عناصر نہ سہی لیکن جذباتی صداقت کے اظہار کے لیے موزوں، موثر زبان استعمال کی گئی ہے جو کم ہی کسی شاعر کے ہاں ملتی ہے۔ مرزا شوق نے مثنوی کے اسلوب میں لکھنوی تہذیب و تمدن کے پر تصنع اسلوب کے دور میں سادہ اور دلکش زبان کی بنیاد ڈالی۔ ان کی مثنویاں لکھنوی شاعری کے مصنوعی دور میں معجزے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بقول جوش ملیح آبادی:

''ان مثنویوں کے اندر تقریباً وہ سب کچھ ہے جو حقیقی شاعری میں ہونا چاہیے۔''[۱۸]

خواجہ احمد فاروقی مزید اس کتاب میں بیان کرتے ہیں کہ شوق نے آپ بیتی کا رنگ اختیار کر کے قصے کو اتنا اصل بنا دیا ہے کہ ہمیں واقعے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ شوق کی مثنوی آپ بیتی ہے جگ بیتی نہیں۔ اور ان مثنویوں کے ہیرو خود مرزا شوق ہیں۔ 'زہر عشق' مرزا شوق کی سب سے بہتر مثنوی ہے اور اثر انگیزی کے لحاظ سے اردو میں بہت کم ایسی مثنویاں ہیں جو اس کے مقابلے میں لائی جا سکتی ہیں۔ مرزا شوق نے مثنوی نگاری کی تاریخ میں عام روش سے بچ کر راہ نکالی ہے۔ لکھنو کے پر تضع ماحول سے نکل کر حقیقی اور سچی شاعری کا مکمل یادگار نمونہ چھوڑا ہے اس وجہ سے نہ صرف اردو بلکہ ان کو دنیا کے بڑے مثنوی نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پروفیسر وقار عظیم 'زہرِ عشق' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''زہر عشق میں موضوع کی عظمت اور فن کی وہ نزاکت اور لطافت نہ سہی جو رومی اور میر حسن کا حصہ ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے جو رومی کی دسترس سے بھی باہر ہے اور میر حسن کی بھی۔''[۱۹]

مثنوی 'زہر عشق' مرزا شوق کی وہ شاہکار مثنوی ہے جس کے طفیل ان کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ زہر عشق کی اثر انگیزی اور دل گدازی سننے والے اور پڑھنے والے کو اپنے اثر میں لے لیتی ہے۔

زہر عشق کی داستان اور اس کا اسلوب بلحاظ اثر پذیری صرف دبستان لکھنو میں نہیں بلکہ منظوم شخصی افسانہ نگاری کی پوری تاریخ میں بے مثل ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رائے دیتے ہیں کہ:۔

''زہرِ عشق' کا سا قبول عام اردو کی دوسری مثنوی حتیٰ کہ سحر البیان کو بھی جو یقیناً اردو زبان

کی بڑے اونچے پائے کی مثنوی ہے، حاصل نہ ہوا۔"[۲۰]

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری؛ زہر عشق پر پابندی اس کی عریانی اور فحش نگاری کی وجہ سے نہیں لگائی گئی بلکہ اس کی اثر انگیزی ہے۔ زہر عشق شروع سے آخر تک سنجیدہ مثنوی ہے فریب عشق یا بہار عشق سے ان کا مقابلہ کرنا درست نہیں۔ جو سوز و گداز اور شدت اثر زہر عشق میں ہے وہ ان کی دوسری مثنویوں میں نہیں ہے۔

درحقیقت زہر عشق کی اثر انگیزی کا راز جذبات کی سچی تصوری کشی اور کامیاب سیرت نگاری میں پوشیدہ ہے۔ مرزا شوق نے تمام کرداروں ہیرو، ہیروئن ماما، ماں باپ سب کے جذبات کی ترجمانی موقع محل اور ان کی نفسیات اور مزاج کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ جہاں اس میں کئی خوبیاں ہیں وہ کچھ خامیاں بھی ہیں جو خوبیوں کے سامنے نظر انداز کی جاسکتی ہیں۔ بقول مجنوں گورکھپوری:

> "زہرِ عشق' کا قصہ کچھ اتنا جلد اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا کہ پڑھنے والے کو بے ربطی اور بے ترتیبی کا احساس ہونے لگتا ہے۔"[۲۱]

اکثر منظوم قصوں کا یہی حال ہے کہ وہ اس طرز پر لکھے جاتے ہیں 'زہر عشق' کے ادبی وفنی محاسن اتنے جمع ہو گئے ہیں کہ چند ایک خامیاں اہمیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ اپنے خلوص اور سادگی بیان کی بدولت 'زہر عشق' بقول فراق گورکھپوری دنیا کی مشہور نظموں میں شامل کیے جانے کے قابل ہے۔ اس لیے اس طویل نظم پر اردو ادب کو آج بھی ناز ہے۔

گویا ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے 'گلزار نسیم'، 'سحر البیان' اور 'زہر عشق' کا جو جائزہ تحقیقی و تنقیدی طرز پر پیش کیا ہے۔۔ وہ ان داستانوں کا صرف ایک تقابل نہیں بلکہ ان کے حوالے سے کردار نگاری۔ داستانوی عناصر، حقیقت و افسانوی بیان، طرز اسلوب اور پلاٹ نگاری کا بھی ایک بھرپور جائزہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان اہم مثنویات کے حوالے سے ناقدین و محققین کی آراء کو بھی پیش نظر رکھا۔ اور یہ ثابت کیا کہ یہ منظوم داستانیں درحقیقت اردو ادب کا بہترین اور گراں قدر سرمایہ ہے جن کی اہمیت سے کسی طرح سے انکار ممکن نہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو کی منظوم داستانیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۲ء)، ۱۳۔

۲۔ مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد چہارم (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۲۳ء)، ۲۴۷۔

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو کی بہترین مثنویاں (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء)، ۸۔

۴۔ ایضاً، ۷۔

۵۔ مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد چہارم، ۲۴۷۔

۶۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو کی بہترین مثنویاں، ۱۸۔

۷۔ ایضاً، ۲۰۔

۸۔ ایضاً، ۲۲۔

۹۔ ایضاً، ۶۹۔

۱۰۔ ایضاً، ۱۱۴-۱۱۵۔

۱۱۔ ایضاً، ۱۳۱۔

۱۲۔ ابو اللّیث صدیقی، لکھنو کا دبستان شاعری (لاہور: مطبوعہ اردو مرکز، س۔ن)، ۵۰۔

۱۳۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو (لکھنو: مطبع نول کشور، س۔ن)، ۱۰۔

۱۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو شاعری کا فنی ارتقا (دہلی: م۔ن، ۲۰۰۴ء)، ۳۔

۱۵۔ ایضاً، ۱۹۷۔

۱۶۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو کی بہترین مثنویاں، ۱۴۲۔

۱۷۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نواب مرزا شوق کی مثنویاں (ناقص الطرفین)، دیباچہ، ۲۔

۱۸۔ خواجہ احمد فاروقی، ”دیباچہ“، مشمولہ: مرزا شوق لکھنوی (لکھنو: مطبوعہ نگار بک ایجنسی، ۱۹۵۰ء)، ۲۔

۱۹۔ عشرت رحمانی (مرتب)، تعارف زہر عشق (ناقص الاول)، ۱۰۔

۲۰۔ ابو اللّیث صدیقی، لکھنو کا دبستان شاعری، ۵۵۴۔

۲۱۔ مجنوں گورکھپوری (مرتب)، زہرِ عشق (ناقص الاول)، ۱۱۰۔